اقبالؒ — مشرق کا بلند ستارہ

سید علی خامنہ ای
صدر اسلامی جمہوریہ ایران

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

مَیں صادقانہ طور پر عرض کر رہا ہوں کہ آج جب اقبالِ عزیز کی قدر دانی اور یہ جلسہ دیکھ رہا ہوں، میری زندگی کے پُرجوش ترین اور یادگار ایام میں سے ایک ہے۔

وہ چمکتی ہوئی چنگاری جو گھٹن کے ماحول کے تاریک و سیاہ ایام میں اُن کی یاد، اُن کے شعر، اُن کی فصیحت اور سبق کے ذریعے دل سے ناامیدی کو دُور کرتی تھی اور ہماری نگاہوں کے سامنے ایک روشن مستقبل کا خاکہ کھینچتی تھی، آج ایک روشن مشعل ہے جو خوش قسمتی کے ساتھ ہماری قوم کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کر رہی ہے۔

افسوس کہ ہمارے عوام جو اقبال کے پہلے عالمی مخاطب تھے بہت دیر سے اقبال سے روشناس ہوتے۔ ہمارے ملک کی خاص صورت حال اور خاص طور پر اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں اُن کے محبوب ملک یعنی ایران میں سامراج کی منحوس پالیسیوں کا تسلط اس کا سبب بنا کہ اقبال ہرگز بھی ایران نہ آئیں۔

فارسی کے اس عظیم شاعر نے جس نے اپنے زیادہ تر اشعار کو اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ فارسی میں کہا ہے کبھی بھی اپنی محبوب اور مطلوب فضا 'ایران' میں قدم نہیں رکھا اور نہ صرف یہ کہ وہ ایران نہیں آئے بلکہ انہی سیاستوں نے جن کا اقبال مدتوں تک مقابلہ کرتے رہے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ اقبال کا نظریہ، اقبال کی راہ اور اقبال کا دیا ہوا سبق ایرانی عوام کے کانوں تک پہنچے جو سُننے کے لیے سب سے زیادہ آمادہ لوگ تھے۔ اس سوال کا جواب کہ اقبال ایران کیوں نہیں آئے، میرے پاس ہے۔

اُس وقت جب اقبال کے افتخار اور شہرت کے عروج کا زمانہ تھا اور جو صفحہ کے مختلف حصوں اور دنیا کی معروف یونیورسٹیوں میں ان کو ایک عظیم مفکر، فلسفی، دانشور، انسان شناس اور ماہر عمرانیات کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، ہمارے ملک میں ایسی سیاستیں حکم فرما تھیں کہ اقبال کو کسی طرح بھی برداشت

نہیں کر سکتی تھیں لہٰذا اُن کے ایران آنے کے امکانات فراہم نہیں ہوئے اور ان کی کتابیں ۱۱ سال تک ایران میں شائع نہیں ہوئیں۔ انہی ایّام میں جب اس ملک میں ایرانی اور مسلمان انسان کی شخصیت کو نابود کرنے کے لیے غیر ملکیوں کے ادب و ثقافت اور کلام کا ایک تباہ کن سیلاب ہر طرف سے جاری تھا عام محفلوں اور عوام کے سامنے اقبال کی کوئی نظم یا اُن کی کوئی تصنیف نہیں پیش کی گئی۔

آج اقبال کی آرزو یعنی "اسلامی جمہوریت" نے ہمارے ملک میں جامۂ عمل پہن لیا ہے۔ اقبال لوگوں کی انسانی اور اسلامی شخصیّت کے فقدان سے غمگین رہتے تھے اور اسلامی معاشروں کی معنوی ذلّت اور ناامیدی کو سب سے بڑے خطرے کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لہٰذا انھوں نے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ مشرقی انسان اور خصوصاً مسلمان کی ذات اور وجود سے اس بے مصرف گھاس کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوششیں کیں۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو ایک ایسی قوم کو دیکھ سکتے تھے جو اپنے پیروں پر کھڑی ہے اور اپنے قابلِ قدر اسلامی سرمائے سے سیراب ہو کر اور اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسے کے ساتھ نیز دلفریب مغربی زیوروں اور مغرب کے اقداری نظام سے بے اعتنا طاقتورانہ طور سے زندگی گزار رہی ہے۔ مقصد آفریں ہے اور ان اہداف و مقاصد کی راہ پر گامزن ہو کر عاشقانہ طور پر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے اور اپنے آپ کو قومیّت، نیشنلزم اور وطن پرستی کی چار دیواری میں قید نہیں کرتی۔ اقبال کی سب سے بڑی آرزو جو اُن کے تمام قابلِ قدر کلام اور تصنیفات میں نظر آتی ہے یہی تھی کہ وہ یہاں پر ایسی قوم کو دیکھیں اور مَیں مسرور ہوں کہ ہم الحمد للہ اقبال کی آرزو کو اپنے ماحول میں جامۂ عمل پہنتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اس وقت ہمیں یہ موقع ملا (خواہ ذرا دیر سے) کہ عصرِ حاضر کی اس عظیم مفکّر شخصیت اور اس عظیم الشان مصلح اور مجاہد اور انتھک انقلابی کو روشناس کرانے کی کوشش کریں اور اُن کو اپنی قوم سے روشناس کرائیں۔

مَیں اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ اس جلسے میں میری شرکت سرکاری آداب و رسوم سے دُور ہوتی تاکہ اوّل یہ کہ اس عظیم اور محبوب یاد سے بیشتر محظوظ ہو سکتا اور دوئم یہ کہ مجھے اس کا موقع اور امکان حاصل ہوتا کہ اقبال کے سلسلے میں اپنے جذبات کے ایک حصّے کو اس جلسے میں شریک ہونے والوں کے سامنے پیش کرتا۔ اس وقت بھی مَیں بھائیوں اور بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ مَیں یہاں مخلصانہ طور پر اُس شخص کی حیثیت سے جو سالہا سال سے اقبال کا مرید رہا ہے اور جس نے اپنے ذہن میں اقبال کے ساتھ زندگی گزاری ہے، بات کروں تاکہ اس عظیم اجتماع میں اپنے اوپر ان کے عظیم احسان اور اپنے عزیز لوگوں کے ذہن پر اُن کے اثرات کے حق کو کسی حد تک ادا کر سکوں۔

اقبال تاریخِ اسلام کی اُن نمایاں اور اتنی گہری اور اعلیٰ شخصیتوں میں سے ہیں کہ ان کی خصوصیات اور زندگی کے صرف ایک پہلو کو مدِّ نظر نہیں رکھا جا سکتا اور ان کی اس پہلو اور اُس خصوصیت کے لحاظ سے

تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہم صرف اسی پر اکتفا کریں اور کہیں کہ اقبالؔ ایک فلسفی ہیں اور ایک عالم ہیں تو ہم نے حق ادا نہیں کیا۔ اقبالؔ بلا شک ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کا بڑے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ اقبال کے اردو کلام کے بارے میں اُردو زبان و ادب کے ماہرین کہتے ہیں 'بہترین ہے'۔ شاید یہ تعریف اقبال کی بڑی تعریف نہ ہو کیونکہ اُردو زبان کی ثقافت اور نظم کا سابقہ زیادہ نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے اُردو کلام نے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں برصغیر کے افراد پر (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) گہرا اثر ڈالا ہے اور اُن کو اُس جدوجہد میں جو اُس وقت تدریجی طور پر بڑھ رہی تھی، زیادہ سے زیادہ جوش دلایا ہے۔ خود اقبالؔ بھی مثنوی اسرار خودی میں کہتے ہیں:

باغباں زورِ کلامم آزمود

مصرعی کارید و شمشیری درود

اور میرا استنباط یہ ہے کہ وہ یہاں پر اپنے اُردو کلام کے بارے میں کہتے ہیں جو اس وقت برصغیر کے تمام لوگوں کے لیے جانا پہچانا تھا۔

اقبال کا فارسی کلام بھی میرے نزدیک شعری معجزات میں سے ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں فارسی میں شعر کہنے والے غیر ایرانی بہت زیادہ ہیں لیکن کسی کی بھی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جو فارسی میں شعر کہنے میں اقبال کی خصوصیات کا مالک ہو۔

اقبال فارسی بات چیت اور محاورے سے ناواقف تھے اور اپنے گھر میں اور اپنے دوستوں سے اُردو یا انگریزی میں بات کرتے تھے۔ اقبال کو فارسی مضمون نگاری اور فارسی نثر سے واقفیت نہیں تھی اور اقبال کی فارسی نثر وہی تعبیرات ہیں جو انہوں نے "اسرار خودی" اور "رموزِ بے خودی" کی ابتداء میں تحریر کی ہیں اور آپ دیکھتے ہیں کہ ان کا سمجھنا فارسی سمجھنے والوں کے لیے مشکل ہے۔ اقبال نے ایامِ طفلی اور جوانی میں کسی بھی مدرسے میں فارسی نہیں پڑھی تھی اور اپنے والد کے گھر میں اُردو بولتے تھے لہٰذا انہوں نے فارسی کا انتخاب صرف اس لیے کیا کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے افکار اور مضامین اُردو کے سانچے میں نہیں سماتے تھے اور اس طرح انہوں نے فارسی سے انسیت حاصل کی۔ انہوں نے سعدیؔ و حافظؔ کے دیوان اور مثنوی مولانا اور سبک ہندی کے شعراء مثلاً عرفیؔ، نظیریؔ اور غالب دہلوی نیز دیگر شعراء کے کلام کو پڑھ کر فارسی سیکھی۔ اگرچہ وہ فارسی ماحول میں نہیں رہے تھے اور انہوں نے فارسی کی پرورش گاہ میں ہرگز بھی زندگی نہیں گزاری تھی اور فارسی بولنے والوں سے مصاحبت نہیں کی تھی لیکن انہوں نے ظریف ترین، دقیق ترین اور نایاب ترین ذہنی مضامین کو اپنی طویل (اور بعض نہایت اعلیٰ) نظموں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا اور یہ چیز میری رائے میں اعلیٰ شعری استعداد اور صلاحیت ہے۔ اگر آپ اُن لوگوں

کے اشعار کو دیکھیں جو ایرانی نہیں تھے لیکن انہوں نے فارسی میں کلام کہا ہے اور اُن کا اقبال کے کلام سے موازنہ کریں تو آپ کے لیے اقبال کی عظمت واضح ہو جائے گی۔

اقبال کے بعض مضامین جن کو انہوں نے ایک شعر میں بیان کر دیا ہے ایسے ہیں کہ اگر انسان چاہے کہ نثر میں بیان کرے تو نہیں کر سکتا اور ہمیں ایک مدت تک زحمت اٹھانی پڑے گی کہ ایک شعر کو جس کو انہوں نے آسانی کے ساتھ بیان کر دیا ہے، فارسی نثر میں جو ہماری اپنی زبان بھی ہے، بیان کریں۔

میں جناب ڈاکٹر مجتبوی کا ان اشعار کے لیے جو انہوں نے پڑھے ممنون ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ اقبال کے کلام کو زندہ کیجیے کیونکہ اقبال کو متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ اُن کا کلام ہے اور اقبال کو کوئی بھی بیان متعارف نہیں کرا سکتا۔

اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کے بعض فارسی اشعار اپنے عروج پر پہنچے ہوتے ہیں۔ اقبال نے مختلف طرزوں مثلاً طرزِ ہندی، طرزِ عراقی اور حتیٰ کہ طرزِ خراسانی میں شعر کہے ہیں اور ان تمام طرزوں میں بھی اچھے شعر کہے ہیں۔ انہوں نے مختلف شعری قالبوں یعنی مثنوی، غزل، قطعہ، دوبیتی اور رباعی کا استعمال کیا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اچھے شعر کہے ہیں اور اعلیٰ مضامین کو باندھا ہے۔ بعض اوقات تو اُن کا کلام ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے جبکہ اس شخص کو فارسی بولنا اور فارسی لکھنا نہیں آتا ہے اور فارسی والے گھرانے میں پیدا نہیں ہوا اور فارسی کے مرکز میں بھی زندگی نہیں گزاری۔ یہ استعداد ہے لہٰذا اقبال کی ایک شاعر کے عنوان سے تعریف یقیناً اُن کو چھوٹا کرنا ہے۔

اقبال ایک عظیم مصلح اور حریت پسند ہیں اور اگرچہ حریت پسندی اور سماجی اصلاح میں اقبال کا رتبہ بہت زیادہ اہم ہے لیکن اقبال کو صرف سماجی مصلح نہیں پکارا جا سکتا کیونکہ اسی برصغیر میں اقبال کے ہم عصروں میں کچھ ہندو اور مسلمان لوگ ہندوستان کے سماجی مصلح مانے جاتے ہیں جن میں سے اکثر کو ہم پہچانتے ہیں اور اُن کی تصنیفات موجود ہیں اور ان کی جدوجہدوں کا علم ہے۔

خود مسلمانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مرحوم قائداعظم (محمد علی جناح) جیسی نمایاں شخصیتیں اور دیگر شخصیتیں موجود تھیں جن کی زندگی کے ایام بھی اقبال کی حیات کی مانند تھے۔ اور وہ لوگ ایک ہی نسل اور ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے تھے اور حریت پسندوں اور مجاہدوں میں شامل تھے لیکن اقبال ان سب سے بڑے ہیں اور اقبال کے کام کی عظمت کا ان میں سے کسی سے بھی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی زیادہ سے زیادہ اہمیت اور قدر جو ہم مولانا ابوالکلام کے لیے قائل ہیں جو ایک نمایاں شخصیت رکھتے ہیں اور حقیقتاً ان کی اہمیت کو کم نہیں سمجھنا چاہیے، یا مولانا محمد علی یا مولانا شوکت علی کے سلسلے میں ہم جس اہمیت کے قائل ہیں، یہ ہے کہ یہ لوگ انتھک مسلمان مجاہد تھے جنہوں نے اپنے ملک سے برطانیہ کو

نکالنے کے لیے برسہا برس کوشش کی اور اس سلسلے میں بہت زیادہ جدوجہد کی۔ لیکن اقبال کا مسئلہ صرف ہندوستان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسلامی دنیا اور مشرق کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" میں اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اقبال کی تیز نگاہیں کس طرح اس تمام دنیا کی طرف متوجہ ہیں جو ظلم و ستم کا شکار ہے اور ان کی توجہ اسلامی دنیا کے تمام گوشوں کی جانب ہے۔ اقبال کے لیے مسئلہ صرف مسئلہ ہند نہیں ہے لہٰذا اگر اقبال کو ایک اجتماعی مصلح بھی پکاریں تو حقیقت میں ہم اقبال کی پوری شخصیت کو بیان نہیں کرتے اور مجھے وہ لفظ اور عبارت نہیں ملتی جس سے ہم اقبال کی تعریف کر سکیں۔

لہٰذا آپ دیکھیے کہ یہ شخصیت، یہ عظمت اور اس عظیم انسان کی ذات اور اس کے ذہن میں معانی کی یہ گہرائی کہاں اور ہمارے لوگوں کی ان کے سلسلے میں واقفیت کہاں اور حق تو یہ ہے کہ ہم اقبال کی شناخت کے مسئلے سے دوچار ہیں۔

بہرحال یہ سیمینار ان بہترین کاموں میں سے ہے جو انجام پایا لیکن اس پر بھی اکتفا نہیں کرنی چاہیے اور میں ثقافت اور تعلیمات کے محترم وزیر اور یونیورسٹی سے منسلک بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ملک میں اقبال کے نام پر فاؤنڈیشنوں کے قیام اور یونیورسٹیوں، ہالوں اور ثقافتی اداروں کے ناموں کو اقبال کے نام پر رکھنے کی فکر میں رہیں۔ اقبال کا تعلق ہم سے، اس قوم سے اور اس ملک سے ہے جس طرح کہ اس غزل میں جو جناب ڈاکٹر مجتبوی نے پڑھی اور آپ نے سنی۔ اقبال ایرانی عوام سے اپنے لگاؤ کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

چون چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما

اور آخر میں کہتے ہیں:

می رسد مردی کہ زنجیرِ غلامان بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

اور یہ میری اس بات کی تائید ہے جو اقبال کے ایران نہ آنے کی وجہ کے بیان میں، پہلے عرض کر چکا ہوں۔

وہ اس جگہ کو زندان سمجھتے ہیں اور قیدیوں سے مخاطب ہو کر بولتے ہیں۔ اقبال کے دیوان میں بہت سی مثالیں ہیں جو اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ وہ ہندوستان سے ناامید ہو چکے ہیں (کم از کم اپنے زمانے کے ہندوستان سے) اور ایران کی جانب متوجہ ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس مشعل کو جس کو انہوں نے جلا رکھا ہے ایران میں مزید شعلہ ور کریں اور انہیں اس بات کی امید ہے کہ یہاں پر کوئی معجزہ رونما ہو۔ یہ اقبال کا ہم پر حق

ہے اور ہمیں چاہیے کہ اس حق کا احترام کریں۔

اب رہی بات اقبال کی شخصیت کی تو اگر ہم اقبال کی شناخت کرنا چاہیں اور اقبال کے پیغام کی عظمت کو جانیں تو ہمیں خواہ مخواہ اقبال کے دور سے برصغیر کو اور اس دور کو پہچاننا پڑے گا جو اقبال کے دَور پر ختم ہوتا ہے کیونکہ اس شناخت کے بغیر نہ تو اقبال کے پیغام کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ساز و نوائے اقبال اور اُن کے سوز دردوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اقبال کے دَور میں برصغیر اپنے سخت ترین ایام گزار رہا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اقبال ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے یعنی مسلمانوں کے انقلاب کی انگریزوں کے ذریعے سرکوبی کے بیس سال بعد۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت اور برصغیر میں اسلام کی حکم فرمائی پر زبردست وار کیا۔ ہندوستان میں عظیم بغاوت رونما ہوئی اور شاید یہ بغاوت تقریباً دو تین سال تک جاری رہی۔ اس کا عروج ۱۸۵۷ء کے اواسط میں تھا، انگریزوں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اس وار کو جو تقریباً ستّر اسّی سال سے ہندوستان میں اسلام کے پیکر پر کر رہے تھے اچانک فیصلہ کن طور پر کیا اور اپنے خیال میں وہاں سے اسلام کی جڑوں کو کاٹ دیا۔ یعنی اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت کو جو اپنی کمزوری کے دن گزار رہی تھی ختم کر دیا۔ برصغیر ہند میں سامراج کی راہ میں واحد رکاوٹ وہی مسلمانوں کی حکومت تھی جس کو انہوں نے طویل عرصے سے اِدھر اُدھر سے کمزور بنا دیا تھا۔ اس کے بہادر سرداروں اور عظیم شخصیتوں کو ختم کر دیا تھا تاکہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی گہری جڑوں کو کمزور بنائیں۔ اس کے بعد یکبارگی اس تناور اور قدیمی درخت کو جس کی جڑیں کمزور ہو چکی تھیں اور جس کا محافظ بھی نہیں رہا تھا اور اکیلا رہ گیا تھا، کاٹ کر ختم کر دیا اور ہندوستان کو برطانوی سلطنت کا جزو جانا۔

۱۸۵۷ء ہندوستان میں انگریزوں کی مکمل کامیابی کا سال تھا اور اس کے بعد کہ انگریزوں نے ہندوستان کا باضابطہ طور پر برطانیہ سے الحاق کر لیا اور اپنے ملک کا نام سلطنتِ برطانیہ و ہند رکھ لیا، ہندوستان کے کالونی ہونے کا مسئلہ نہیں رہا، بلکہ ہندوستان برطانیہ کے صوبوں میں سے ایک صوبہ بن گیا۔ لہٰذا وہ اپنے مستقبل کی فکر میں پڑ گئے تاکہ اس ملک میں ہر قسم کی بغاوت اور قومی یا مذہبی عظمت کے اعادے کے امکانات کو ختم کر دیں۔ اس کا راستہ یہی تھا کہ مسلمانوں کا مکمل طور پر قلع قمع کریں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں اُن سے مقابلہ کرنے والے مسلمان ہیں اور انہوں نے اس کا تجربہ کیا تھا۔

مسلمانوں نے انیسویں صدی کی ابتدا بلکہ اس سے بھی پہلے سے ہندوستان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخری حصے میں ٹیپو سلطان انگریزوں کے ہاتھوں قتل یا شہید ہوتے لیکن عوام، علماء اور مسلمان قبائل نے انیسویں صدی کی ابتداء سے انگریزوں اور ہندوستان میں اُن پٹھوؤں سے جو اُس وقت

سکھ تھے، جنگ لڑی اور اس بات سے انگریز بخوبی واقف تھے۔ انگریزوں میں سے ان لوگوں نے جو ہندوستانی مسائل سے واقف تھے کہا تھا کہ ہندوستان میں ہمارے دشمن مسلمان ہیں اور ہمیں ان کا قلع قمع کرنا چاہیے لہٰذا انگریزوں کے کامیابی کے سال یعنی ۱۸۵۷ء سے ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے ایک نہایت ظالمانہ اور سنگدلانہ پروگرام شروع ہوگیا جس کا ذکر ہر جگہ آیا ہے اور یہاں پر اس کا ذکر طوالت کا سبب بنے گا۔ وہ لوگ جو مزید معلومات کے خواہاں ہیں اس سلسلے میں لکھی گئی متعدد کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مالی اور ثقافتی لحاظ سے ان پر دباؤ ڈالا جاتا تھا اور سماجی شعبوں میں ان کی بہت تحقیر کی جاتی تھی۔ انگریز املاک کرتے تھے کہ وہ لوگ جو چاہتے ہیں ملازمت حاصل کریں ان کو مسلمان نہیں ہونا چاہیے۔ جب ایک معمولی سی تنخواہ پر کچھ لوگوں کو ملازم رکھتے تھے، اُس وقت مسلمانوں کو ملازم رکھنے سے دریغ کرتے تھے، انہوں نے ہندوستان میں مسجدوں اور اسلامی مدرسوں کو چلانے والے تمام موقوفات کو جو بہت زیادہ تھے، اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہندو تاجروں کو ورغلایا کہ مسلمانوں کو بھاری بھاری قرضے دیں تاکہ دیے جانے والے قرضے کے عوض ان کی جائدادوں کو لے لیں اور ان کے زمین سے تعلق اور صاحبِ خانہ ہونے کے احساس کو بالکل ختم کر دیں۔ برسہا برس تک یہ کام جاری رہا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ اُن کے اچھے سلوک کا حصّہ تھا اور اس سے بدتر یہ تھا کہ اُن کو بے دریغ قتل کرتے تھے اور بے دریغ جیل میں ڈالتے تھے۔ تمام اُن لوگوں کی جن پر انگریزوں کے خلاف اقدامات کرنے کا ذرا سا بھی شک ہوتا بہت سرکوبی کرتے تھے اور اُن کو نابود کر دیتے تھے۔ یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا۔ ان سخت تکلیف دہ حالات کو دس بیس سال گزر جانے کے بعد (کہ جس کی مثال درحقیقت کسی بھی اسلامی ملک میں مجھے نہیں نظر آتی۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ہو لیکن میں نے دنیا کے اُن ممالک کے مختلف علاقوں میں جہاں سامراج موجود رہا ہے مثلاً الجزائر اور افریقی ممالک میں، جہاں بھی نظر ڈالی ہے مجھے یاد نہیں کہ مسلمانوں پر اتنا برا وقت دیکھا ہو جتنا کہ ہندوستان میں ڈالا گیا ہے) کچھ لوگوں نے چارہ جوئی کی فکر کی اور انگریزوں سے مقابلے کا سلسلہ مسلمانوں میں ختم نہیں ہوا تھا، اور یہ ایک ایسی چیز ہے جسے ہندوستان کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلمان انگریزوں سے مقابلے میں نمایاں ترین اور اصلی ترین عامل تھے۔ اور واقعتاً ناشکری ہوگی اگر ہندوستان اپنے اوپر مسلمانوں کے احسانات کو فراموش کر دے کیونکہ وہاں پر وجود میں آنے والے عظیم انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کی وجہ بننے والی جدوجہدوں میں مسلمان اپنی حریت پسندی کی خاطر کبھی بھی خاموش نہیں بیٹھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے برسوں میں جب ہر جگہ خاموشی تھی بنابرایں مسلمان عناصر مختلف جگہوں پر اپنے کام میں مصروف تھے لیکن ان میں دو قسم کی تحریکیں تھیں یا تو ثقافتی سیاسی تھی یا صرف ثقافتی تحریکیں تھیں، مسلمانوں کی یہ دو تحریکیں چارہ جوئی کے لیے جاری تھیں۔ ان دونوں تحریکوں میں سے ایک علماء کی تحریک تھی اور دوسری

سرسیّد احمد خان کی تحریک اور یہ دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل تھیں۔ یہاں پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں لیکن مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ علماء کی تحریک انگریزوں سے مقابلے اور اُن سے تعلقات ختم کرنے اور اُن کے اسکولوں میں شریک نہ ہونے اور انگریزوں سے کسی قسم کی مدد نہ لینے کی علمبردار تھی اور سرسیّد احمد خان کی تحریک اس کے برخلاف انگریزوں سے مصالحت کرنے، اُن کے ذرائع سے فائدہ اُٹھانے، انگریزوں سے مُسکرا کر پیش آنے اور اُن سے سمجھوتہ کرنے کی حامی تھی۔ یہ دو تحریکیں ایک دوسرے کے مدِمقابل تھیں اور افسوس کہ آخرکار دونوں تحریکیں مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ پہلی تحریک جو علماء کی تحریک تھی اور جس کی قیادت ایسے بڑے علماء کے ہاتھ میں تھی جو تاریخِ ہند کی نمایاں شخصیتیں ہیں، یہ مقابلہ کرتے تھے اور اُن کی جدوجہد درست تھی لیکن اُن ابتدائی چیزوں سے فائدہ اُٹھانے سے پرہیز کرتے تھے جو ہندوستان میں اسلامی معاشرے کو جدید ترقیات کے حصول میں مدد کرتی تھیں اور مثال کے طور پر وہ اپنے مدرسوں میں انگریزی زبان کو ہرگز بھی داخل نہیں ہونے دیتے تھے اور شاید اُس وقت ان کو اس کا حق پہنچتا تھا کیا ایسا سوچیں کیونکہ انگریزی زبان کو فارسی زبان کا جو مسلمانوں کی محبوب زبان تھی اور صدیوں تک برصغیر میں سرکاری زبان تھی، جانشین بنا دیا تھا اور یہ لوگ انگریزی زبان کو حملہ آور کی زبان سمجھتے تھے۔ لیکن بہرحال انگریزی کا نہ سیکھنا اور نئی ثقافت کی جانب جو آخرکار لوگوں کی زندگی کے شعبوں میں داخل ہو رہی تھی توجہ نہ دینا اس بات کا سبب بنا کہ اُمّتِ اسلامی اور ملّتِ مسلمان ثقافت، معلومات، عصری قوتوں اور عصری علوم میں جو تمام معاشروں کے لیے (جو جدید بننے کی جانب بڑھ رہے تھے) مؤثر اور مفید ہیں پیچھے رہ جاتے۔ مسلمانوں کو ان علوم سے دور رکھتے تھے۔

لیکن سرسیّد احمد کی تحریک زیادہ خطرناک تھی اور میں چاہتا ہوں کہ یہاں پر سیّد احمد خان کے بارے میں اپنے قطعی فیصلے کو بیان کروں۔ ممکن ہے کہ موجود بھائیوں میں سے بعض اس بات کے قائل نہ ہوں۔ سیّد احمد خان نے یقینی طور پر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں کوئی کام نہیں کیا اور میرا عقیدہ ہے کہ اقبال کی تحریک ہندوستان میں، اس کام کے خلاف فریاد تھی جس کا پرچم سرسیّد احمد خان نے اُٹھایا تھا۔ سیّد احمد خان نے انگریزوں سے مصالحت کو بنیاد بنایا اور اُن کا بہانہ یہ تھا کہ آخرکار ہمیں مسلمان نسل کو جدید ثقافت میں داخل کرنا چاہیے کیونکہ ہم اُن کو ہمیشہ کے لیے جدید تہذیب سے ناواقف اور دُور نہیں رکھ سکتے لہٰذا انگریزوں سے مصالحت کرنی چاہیے تاکہ ہم پر سختی نہ کریں اور ہماری عورتیں، بچے اور مرد انگریزوں سے دشمنی کی خاطر اس قدر تکلیف نہ اٹھائیں۔

وہ سادہ لوحی کے ساتھ خیال کرتے تھے کہ انگریزوں سے تواضع مصالحت اور اظہارِ عقیدت کے ذریعے ان تجربہ کار جدید سیاستدانوں کی توجہ کو مبذول کرا سکتے ہیں اور ان کی ایذا رسانیوں کو کم کر سکتے ہیں جبکہ

یہ ایک بڑی غلطی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود سید احمد خان اور ان کے قریبی لوگ نیز وہ روشن خیال لوگ جو اُن کے اردگرد تھے، انگریزوں کے نقصانات سے محفوظ رہے لیکن مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد ہونے یعنی ۱۹۴۷ء تک انگریزوں سے ہمیشہ ہی نقصان پہنچا اور انگریزوں نے اس نوّے سال کی مدت میں (۱۸۵۷ء سے ہندوستان کی آزادی کے سال ۱۹۴۷ء تک) مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر سکے، کیا۔ لہٰذا انگریزوں کو رام کرنے کے لیے سید احمد خان کا حیلہ مسلمانوں کو ذلیل کرنے کا سبب بنا اور اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہوا، جو اقبال کی شناخت اور اقبال کے پیغام کے مضمون کو سمجھنے میں مؤثر ہے اور وہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں، مسلمان روشن خیالوں اور ان تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لیے جو سماجی میدان میں داخل ہوتے تھے آگاہی، علم و معرفت، حصولِ علم اور عہدہ اہمیت رکھتا تھا، لیکن اسلامی تشخص کو ہرگز بھی اہمیت حاصل نہیں تھی اور تدریجی طور پر ہندوستان کے علیم مسلم معاشرے میں جو دنیا کے علیم ترین مسلمان معاشروں میں سے تھا (اور اس وقت بھی ایسا کوئی ملک نہیں جس کے مسلمانوں کی تعداد اس زمانے کے برصغیر کے مسلمانوں کے برابر ہو) وہ اسلامی تشخص کا احساس نہیں رکھتے تھے اور اپنے لیے اسلامی شخصیت کے قائل نہ تھے اور بنیادی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں میں مستقبل کے لیے کوئی امید ہی نہیں تھی۔ چونکہ انہوں نے بہت تکلیفیں برداشت کی تھیں اور ان کی تحقیر کی گئی تھی عام حادثات اور واقعات ان کی ناامیدی، تلخ کلامی اور بدفرجامی کی نشان دہی کرتے تھے اور اب حقارت ہندوستانی مسلمان کی ذات کا جزو بن گئی اور ذلت و ناتوانی کا احساس ہندوستانی مسلمان کی شخصیت کے اجزاء میں شمار ہوتا تھا۔

اس زمانے میں جب اقبال احتمالاً ۱۹۰۸ یا ۱۹۰۹ء میں یورپ سے جدید تہذیب سے جھولی بھر کے لوٹے تھے، اُس وقت اقبال کے ہم عصر روشن خیال اور ہم نوا (خود ان کے قول کے مطابق) مغربی تہذیب پر نظریں جماتے ہوتے تھے اور اُن شخصیتوں کی مانند جن کی طرف جناب مجتبوی نے میرے حوالے سے اشارہ کیا ہے، ایران میں تھیں اپنا اعتبار اس چیز میں دیکھتی تھیں کہ اپنے آپ کو مغربی تہذیب سے کچھ زیادہ ملائیں اور مغربی اقدار کے نظام کو اپنے عمل، اپنی روش، لباس، بات چیت اور حتیٰ کہ اپنے افکار اور نظریات میں جلوہ گر کریں۔ اُس برطانوی حکومتی مشینری کی غلامی جو اُس وقت ہندوستان پر قدرتمندی کے ساتھ حکومت کر رہی تھی، مسلمانوں کے لیے فخر تھی اور ہندو، جو مسلمانوں سے چند سال پہلے اسی تہذیب اور انہی آداب و رسوم میں داخل ہو گئے تھے اور جنہوں نے انگریزوں سے میل جول کو بہت پہلے ہی اختیار کر لیا تھا اور اسی وجہ سے صنعت ثقافت اور انتظامی امور میں کچھ پہلے شامل ہو گئے تھے، اُن کا اعتبار تھا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے بھی ذلت اور زحمت اٹھانی پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ سکھ بھی اگرچہ بہت چھوٹی اقلیت رکھتے تھے اور وہ قابل فخر چیزیں جو ہندوؤں کو اُپنیشدوں اور اپنے تاریخی اور تہذیبی ماضی سے حاصل تھیں، سکھوں کی زندگی میں نہیں تھیں اور آپ کو

معلوم ہے کہ یہ ایک نیا قائم ہونے والا مذہب ہے جس میں اسلام اور ہندوازم نیز دوسری چیزوں کی آمیزش ہے، یہ سکھ بھی مسلمانوں کی تحقیر کرتے تھے اور اُن کی توہین کرتے تھے۔ یہ تھی اقبال کے زمانے میں برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشرے کی صورتِ حال۔ اسی لاہور کی یونیورسٹی میں جہاں پر اقبال نے تعلیم حاصل کی اور بی۔ اے کیا ہے ہم امید بخش اسلامی افکار کے ظہور کی کوئی علامت نہیں دیکھتے۔ وہاں پر سب سے بڑی اسلامی کتاب، سرتھامس آرنولڈ کی کتاب ہے (یعنی الدعوۃ الی الاسلام" نامی کتاب) جو عربی زبان میں ہے اور حال ہی میں اس کا فارسی ترجمہ بھی شائع ہوگیا ہے۔ یہ سرتھامس آرنولڈ کے اُس دَور کے کاموں میں سے ہے جب وہ لاہور کی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ البتہ یہ کتاب ایک اچھی کتاب ہے اور میں اس کو مسترد نہیں کرنا چاہتا لیکن ان کا سب سے بڑا فن یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اسلامی جہاد کو تلویحی طور پر ایک دوسرے درجے کی چیز بتائیں لہٰذا اس کتاب کا آئیڈیا یہ ہے کہ اسلام، دعوت سے پھیلا ہے نہ کہ تلوار سے اور یہ ایک اچھی بات ہے لیکن وہ اس خیال میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اسلامی جہاد اس کتاب میں تقریباً دوسرے درجے کی ایک چیز اور ایک بے فائدہ اور زائد چیز نظر آتی ہے۔

اس کتاب کے اسلامی کام کا ماحصل یہی ہے! اس کے علاوہ وہ صاحبان اور خواتین جنہوں نے سر تھامس آرنولڈ کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جانتے ہیں کہ وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جن کو اسلام کا زبردست حامی سمجھا گیا ہے اور وہ اقبال کے استاد ہیں اور اقبال ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔ بہتر ہے کہ بس یہاں پر اس بات کا ذکر کردوں کہ اس عظیم انسان کی ہوشیاری سے علامہ اقبال باوجود اس کے کہ سرتھامس آرنولڈ سے سخت محبت کرتے تھے ان کے کاموں میں سیاسی افکار سے غفلت نہیں برتتے تھے۔ اس بات کو جناب جاوید اقبال نے اپنے والد کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ اس کی ایک جلد فارسی میں ترجمہ ہوچکی ہے اور میں نے دیکھا ہے۔ اقبال اپنے دوست سید نذیر نیازی کو جو سرتھامس آرنولڈ کو ایک اسلام شناس جانتے ہیں، خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: کون سی اسلام شناسی؟ تم اُن کی کتاب "الدعوۃ الی الاسلام" کی بات کرتے ہو؟

وہ حکومت برطانیہ کے لیے کام کرتے ہیں اور بعد میں اقبال اپنے اُس دوست سے کہتے ہیں:

> جب میں برطانیہ میں تھا تو آرنولڈ نے مجھ سے کہا کہ ایڈورڈ براؤن کی تاریخ ادبیات کا ترجمہ کردوں اور میں نے یہ کام نہیں کرنا چاہا کیونکہ میں نے دیکھا کہ یہ کتاب سیاسی مقاصد سے آمیختہ ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ ایڈورڈ براؤن کی کتاب کے بارے میں اقبال کا نظریہ یہ ہے اور ہمارے ادیبوں کا نظریہ، ایڈورڈ براؤن کے دوستوں اور اُن لوگوں کو جو ایڈورڈ براؤن کی دوستی پر فخر کرتے تھے دیکھنا چاہیے

کر اُن کا نظریہ کیا ہے ؟ اور میں اس وقت ان شخصیتوں کا نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ بہر حال ادبی اور ثقافتی شخصیتیں ہیں لیکن سادہ دل ، ناآگاہ اور اُن سیاسی مقاصد سے بے خبر ہیں لیکن اقبال وہ ہوشیار مرد اور "المومن کیّس" کی مانند خبیث استعماری سیاست کی ریشہ دوانیوں کو تھامس آرنولڈ اور ایڈورڈ براؤن کے کاموں میں پہچانتے اور دیکھتے ہیں اور یہ بات اقبال کی عظمت کی نشان دہی کرتی ہے ۔ اس زمانے میں برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ حکومت برطانیہ ، حکومت برطانیہ کے اصل ایجنٹ اور دوسرے درجے کے ایجنٹ (یا اہمیت کے لحاظ سے زیادہ اعلیٰ درجہ نہ رکھنے والے) زیادہ تر ہندو تھے اور ہندوستان کی جدّو جہد جس کی مشعل کو ابتدا میں مسلمانوں نے روشن کیا کانگریس پارٹی کے ہاتھوں میں چلی گئی اور وہ بھی متعصب کانگریس پارٹی کے ۔ انڈین کانگریس نے جس نے آخر کار جدّو جہد کے میدان میں عظیم کارنامے بھی انجام دیے لیکن اُن برسوں میں اُس پر اسلام سے مخالفت کا تعصب ، ہندوؤں کی جانب جھکاؤ اور مسلمانوں کی مخالفت کا تعصب حکم فرما تھا اور مسلمانوں میں روشن خیال لوگ مغرب پرست اور مغربی نظام کے والہ و شیدا تھے اور عام معمولی لوگ شرمناک غربت اور سخت تکلیف دہ زندگی کا شکار تھے اور اپنی معمولی روٹی کو بھی مشکل سے حاصل کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ اس ماحول اور فضا میں گھومتے ہوتے تھے جس کو انگریز زیادہ سے زیادہ مغربیت کی جانب لے جا رہے تھے ۔ ہندوستان کے اس زمانے کے مسلمان علماء ۔ ان ابتدائی شکستوں کے بعد زیادہ تر اَنگ تھلگ اور عزلت پسندی اور تحرک کے ناقابلِ فہم افکار اور جلووں میں کھوتے ہوتے تھے (سوائے ان علماء کے جو آگے آ گئے تھے مثلاً مولانا محمد علی جوہر اور ہندوستان کے دیگر نمایاں حیثیت رکھنے والے علماء)۔ عام مسلمان عوام اس قسم کی سخت تکلیف دہ حالت میں زندگی گزار رہے تھے ، اسلام سیاسی علیحدگی اور اقتصادی غربت میں تھا اور مسلمان عوام ہندوستانی معاشرے میں ایک ایسے طفیلی اور زائد رکن کی حیثیت رکھتے تھے کہ اس تاریک رات میں جس میں ان کا کوئی بھی ستارہ نہ تھا اقبال نے خودی کی مشعل روشن کی ۔ البتہ ہندوستان کی یہ حالت جو میں نے بیان کی صرف ہندوستان کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ تمام اسلامی دنیا میں ایسی ہی حالت تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے ساری دنیا کی فکر کی ۔ البتہ اس زمانے کے لاہور اور بدبخت برصغیر میں اقبال کی روزمرہ کی زندگی نے ان کے لیے ہر چیز کو قابلِ لمس بنا دیا تھا ۔ یہ ایسی حالت میں تھا کہ اقبال نے ترکی ، ایران اور مثلاً حجاز کا سفر نہیں کیا تھا اور بہت سی دوسری جگہوں کو قریب سے نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اپنے ملک کی صورت حال کو قریب سے دیکھ رہے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ثقافتی ، انقلابی اور سیاسی انقلاب برپا کیا ۔ پہلا کام جو اقبال کے لیے ضروری تھا انجام دیں یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرے کو اسلامی تشخص ، اسلامی من اور اسلامی شخصیت بلکہ اس کی انسانی شخصیت کی جانب متوجہ

کریں اور کہیں کہ تو ہے تو کیوں اس قدر غرق ہے؟ کیوں اس قدر مجذوب ہے؟ تو نے کیوں اپنے آپ کو اس قدر کھو دیا ہے؟ اپنے آپ کو پہچان۔

یہ اقبال کا پہلا مشن ہے۔ آخر وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتے تھے؟ کیا وہ سیون کروڑ کی ایک قوم سے جو سالہا سال تک سامراج کے کوڑوں کے سخت دباؤ میں تھی اور جہاں تک ممکن تھا اس کی ناک کو رگڑا گیا اور اس سے سمجھنے، جاننے اور امید رکھنے کے امکانات کو چھین لیا گیا تھا، یکبارگی کہا جا سکتا ہے کہ تو ہے اور وہ بھی ہونے کا احساس کر لے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ بہت دشوار کام ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی شخص اقبال کی حد تک اور جس طرح کہ اقبال نے بیان کیا ہے اس بات کو اتنی خوبی کے ساتھ نہیں بیان کر سکتا تھا۔

اقبال نے ایک فلسفے کی بنیاد رکھی؛ خودی کا فلسفہ ہمارے ذہن کے مدِ نظر فلسفوں کی قسم کا نہیں خودی کا ایک سماجی اور انسانی مفہوم ہے جو فلسفیانہ تعبیرات کے لباس میں اور ایک فلسفیانہ بیان کے لہجہ میں بیان ہوا ہے۔ اقبال کو اپنی نظم، اپنی غزل اور اپنی مثنوی میں خودی پر ایک اصول اور ایک مفہوم کی حیثیت سے زور دینے کے لیے اس چیز کی ضرورت ہے کہ اس خودی کو فلسفیانہ طور پر بیان کریں۔ اقبال کے مدِ نظر مفہوم میں خودی کا مطلب شخصیت کا احساس، شخصیت کا سمجھنا، خود گری، خود اندیشی خود شناسی اور خود کا ادراک ہے۔ البتہ وہ اس بات کو ایک فلسفیانہ بیان اور فلسفیانہ مفہوم کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ میں بہت سارے نوٹ لایا ہوں تاکہ اگر ممکن ہوا تو ان میں سے بعض کو پڑھوں۔ اگرچہ یہ جلسہ طویل ہو گیا ہے لیکن میری درخواست ہے کہ آپ تحمل سے کام لیں۔

میرے خیال میں خودی کا مسئلہ اقبال کے ذہن میں پہلے ایک انقلابی فکر کی شکل میں آتا ہے اور بعد میں وہ اس فکر کو فلسفیانہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور خودی وہی چیز ہے جس کی ہندوستان میں ضرورت تھی اور مجموعی نقطہ نگاہ سے اسلامی دنیا میں اس کی ضرورت تھی یعنی ملل اسلامی اگرچہ اسلامی نظام کی حامل تھیں لیکن انہوں نے اس چیز کو بالکل فراموش کر دیا تھا اور مکمل طور پر فریب کھا کر اقدار کے ایک غیر ملکی نظام کے والہ و شیدا اور معتقد ہو گئے تھے اور ضروری تھا کہ وہ اپنی جانب لوٹیں یعنی اسلامی اقدار کے نظام کی جانب لوٹیں یہ وہی مفہوم ہے جس کے لیے اقبال کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے سماجی مفہوم کا ایک ایسی شکل میں بیان کرنا کہ ذہنوں میں جاگزیں ہو سکے فلسفیانہ بیان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اس مفہوم کو فلسفیانہ بیان کی شکل دیتے ہیں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اُن عبارتوں کو پڑھوں جو میں نے نوٹ کی ہیں۔

اقبال کے ذہن میں "خودی" کا خیال ابتدا میں ایک سماجی اور انقلابی فکر کی شکل میں آیا اور تدریجاً اقوام مشرق (خصوصاً مسلمانوں) میں شخصیت کے انحطاط و زوال اور معصیت کی عظمت کا مشاہدہ اور ان

سے علل و اسباب اور علاج کی شناخت نے اس فکر کو ان کے وجود میں مستحکم اور ناقابلِ خلل بنا دیا اور اس کے بعد اُن کو اس فکر کو پیش کرنے کے طریقے کی جستجو میں ایک فلسفیانہ اور ذہنی بنیاد ملی۔ یہ بنیاد خودی کے مفہوم کا تصور ہے عام شکل میں (اُس چیز کی مانند جس کو ہمارے فلسفی وجود کے مفہوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں یعنی ایک عام مفہوم جو سب میں ہے اور اس کو فلسفیانہ طور پر بیان کیا جا سکتا ہے) البتہ وجود، خودی سے مختلف چیز ہے اور خودی کا مطلب وجود بتانا (مَیں نے دیکھا ہے کہ اقبال کے اشعار پر حاشیہ لکھنے والوں میں سے بعض نے لکھا ہے) میرے خیال میں ایک بڑی غلطی ہے اور وہ وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت جس کی اقبال رموزِ بے خودی میں کئی بار تکرار کرتے ہیں، ملّا صدرا اور دیگر فلسفیوں کے وحدت در کثرت اور کثرت در وحدت کے نظریے سے مختلف ہے۔ یہ کچھ اور چیز ہے اور مجموعی طور پر اقبال کے مدِّ نظر مفاہیم سو فیصد انسانی اور اجتماعی مفاہیم ہیں (البتہ میں جو عرض کر رہا ہوں اجتماعی، اس کا مطلب فرد کے بارے میں بحث نہ کرنا نہیں ہے کیونکہ خودی کی بنیاد فرد میں مستحکم ہوتی ہے لیکن خود فرد میں خودی کی خودیت اور فرد میں خودی کی شخصیت کا استحکام بھی اسلام کے اجتماعی مفاہیم میں سے ایک ہے اور جب تک خودی کی وہ شخصیت مستحکم نہ ہو، حقیقی اور مستحکم شکل میں اجتماع اور معاشرہ وجود میں نہیں آتا)۔

بہرحال خودی کے معنی وجود ہی سے مختلف ہیں۔ وہ اوّل خودی کے مفہوم کی عمومیت کے بارے میں عرفا کی زبان میں اور عرفاء کی مانند تعبیرات میں گفتگو کرتے ہیں:

عالمِ ہستی کی جلوہ گری خودی کے اثرات میں سے ہے۔ عینیاتِ عالم میں سے ہر ایک خودی کے مفہوم کے ایک جلوے کی نشان دہی کرتی ہے (البتہ ان چیزوں کو اقبال نے اکثر نظموں کے عنوانات میں ذکر کیا ہے جس کو میں نے دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے بعض تعبیرات ایسی ہیں جن کو خود انھوں نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے اور ان کا کلام ان تعبیرات سے بہت بہتر ہے)۔ افکار کا سرچشمہ بھی خودی کے مختلف جلووں میں خود آگہی ہے۔ ہر مخلوق میں خودی کا اثبات اس کے علاوہ کا بھی اثبات ہے۔ (جب کسی انسان میں خودی کا اثبات ہوتا ہے، یہ خود بخود دوسری چیز کا بھی اثبات ہے۔ وہ ہے لہٰذا خودی موجود ہے اور ایک دوسری چیز بھی۔ لہٰذا اس کے علاوہ کا بھی اثبات ہے) لہٰذا گویا کہ ساری دنیا خودی میں شامل ہے اور ممکن ہے) خودی دشمنی کا بھی سبب بنتی ہے اور درحقیقت خود ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ یہ کشمکش دنیا میں دائمی پیکار کو جنم دیتی ہے۔ خودی زیادہ صالح کے انتخاب اور زیادہ شائستہ کی بقاء کی حامل بھی ہے اور اکثر ایک والاتر و برتر خود کے لیے ہزاروں خود فنا ہو جاتے ہیں۔ خودی کا مفہوم ایک مشکوک مفہوم ہے۔ اس میں قوت اور ضعف ہے خودی کی قوت اور ضعف دنیا کی ہر مخلوق میں اس مخلوق کے استحکام کے اندازے کا تعین کرتی ہے۔ اس طرح وہ قطرہ، مے، جام، ساقی، کوہ، صحرا، موج

دریا، نورِ چشم، سبزہ، شمع خاموش، شمع گدازاں، نگین، زمین، ماہ، خورشید اور درخت کو مثال کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک میں خودی کی مقدار کا اندازہ لگاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قطرے میں خودی کی ایک خاص مقدار ہے، نہر میں ایک مقدار اور اس نگینے میں جس پر نقوش کھودے جا سکتے ہیں ایک خاص مقدار اور اس پتھر میں جس پر کوئی کھدائی نہیں کی جا سکتی خودی کی ایک خاص مقدار موجود ہے۔ یہ ایک مشکوک مفہوم ہے جو قابل شک ہے اور انسانی افراد اور اشیائے عالم میں مختلف مقدار میں موجود ہے۔ وہ بعد میں نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

چون خودی آرد بہم نیروی زیست
می گشاید قلزمی از جوی زیست

(بعد میں وہ آرزومند ہونے اور مدّعا رکھنے کے مسئلے کو پیش کرتے ہیں اور یہ بالکل وہی چیز ہے جو اس زمانے کی اسلامی دنیا میں نہیں تھی یعنی مسلمانوں کو کسی چیز کا دعویٰ نہیں تھا، ان کی کوئی بڑی آرزو نہیں تھی اور ان کی آرزوئیں تھیں زندگی کی معمولی اور حقیر آرزوئیں تھیں)

وہ کہتے ہیں ایک انسان کی زندگی کا دارومدار مدّعا رکھنے آرزو رکھنے پر ہے، ایک شخص کی خودی یہ ہے کہ وہ آرزومند ہو اور اس آرزو کی جستجو میں بڑھے (اور مجھے یہ جملہ یاد آ گیا: انما الحیٰوۃ عقیدۃ و جہاد)

وہ اسی مضمون اور اسی مفہوم کو بہت وسیع اور گہرے نیز لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: کسی چیز کا چاہنا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنا ہی مدّعا ہے ورنہ زندگی موت میں تبدیل ہو جائے گی۔ آرزو، جانِ جہاں اور صدف فطرت کا گوہر ہے وہ دل جو آرزو پیدا نہ کر سکے پر شکستہ اور بے پرواز ہے اور یہ آرزو ہے جو خودی کو استحکام عطا کرتی ہے اور طوفانی سمندر کی مانند موجوں کو جنم دیتی ہے لذّتِ دیدار ہے جو دیدۂ دیدار کو صورت عطا کرتی ہے، شوخیٔ رفتار ہے جو کبک کو پاؤں عطا کرتی ہے، نوا کی سعی و کوشش ہے جو بلبل کو منقار عطا کرتی ہے بانسری نواز کے ہاتھ اور ہونٹوں میں بانسری ہے جو آبادی پاتی ہے ورنہ نیستاں میں کوئی چیز بھی عملی طور پر نہیں تھی علم و تمدّن، نظم و آداب اور رسومات نیز اصول بھی اُن آرزوؤں سے وجود میں آتے ہیں جن کے لیے کوشش کی گئی ہے اور وہ بعد میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

(مدّعا سازی، آرزو سازی اور ہدف سازی)

یا ایک اور شعر میں اسی موضوع کے بارے میں کہتے ہیں:

گرم خون انسان زداغ آرزو
آتش این خاک از چراغ آرزو

اور بعد میں انسانی معاشرے، انسان اور خودی کے استحکام کے لیے عشق و محبت کو ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں، محبت کے بغیر فرد اور معاشرے میں خودی کو استحکام نہیں حاصل ہوتا اور ضروری ہے کہ ملت مسلمان اور وہ انسان جو چاہتے ہیں اپنی خودی کو مضبوط بنائیں، محبت اور عشق رکھتے ہوں اور اُن کا دل اس آگ میں پگھلے۔ اس کے بعد دلچسپ ہے کہ خود ہی امت اسلامیہ کے عشق کے لیے ایک نقطہ پاتے ہیں اور وہ ہے پیغمبر اکرم محمد مصطفیٰؐ کا عشق یہی وجہ ہے کہ انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ بیدار اور ہوشیار شخص اسلامی دنیا کے اتحاد اور اسلامی دنیا کو تحرک میں لانے سے مسئلے کو کس قدر اچھی طرح سمجھتے ہیں،

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پاینده تر
زنده تر، سوزنده تر، تابنده تر
از محبت اشتعال جوہرش
از لقاء ممکنات مضمرش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق
عالم افروزی بیاموزد ز عشق
در جہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق
آب حیوان، تیغ جوہردار عشق
عاشقی آموز و محبوبی طلب
چشم نوحی، قلب ایوبی عشق
کیمیا پیدا کن از مشت گلی
بوسہ زن بر آستان کاملی

اس کے بعد کہتے ہیں؛ اب وہ معشوق و محبوب جس سے مسلمان کو لگاؤ رکھنا چاہیے اور جس کا عاشق ہونا چاہیے، کون سی ہستی ہے؟

ہست معشوقی نہان اندر دلت
چشم اگر داری بیابنمایمت

عاشقان او ز خوبان خوب تر
خوشتر و زیباتر و محبوب تر
دل ز عشق او توانا می شود
خاک ، ہمدوش ثریا می شود
خاک نجد از فیض او چالاک شد
آمد اندر وجد و بر افلاک شد
در دل مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروی ما ز نام مصطفیٰ است
طور موجی از غبار خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنون خواب راحتش
تاج کسریٰ زیر پای امتش
در شبستان حرا ، خلوت گزید
قوم و آیین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم
تا بہ تخت خسروی خوابید قوم

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں کچھ تشریح کرتے ہیں اور ان کے اوصاف کو بیان کرتے ہیں۔ البتہ اقبال کے پورے دیوان میں اور ان کے سارے کلام میں انسان پیغمبرؐ سے عشق کو دیکھتا ہے اور صرف اسی جگہ کے لیے مخصوص نہیں ہے اور اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ ایک کتاب جس کو پاکستان کے ایک ہم عصر محقق نے اقبال کے بارے میں لکھا ہے اور اس متین و موقر کتاب کا نام "اقبال در راہ مولوی" ہے۔ یہ کتاب مجھے اپنے حالیہ دورے میں ملی اور میں نے اس سے استفادہ کیا ہے، میں نے دیکھا کہ اس میں لکھا ہے :

"جب بھی کوئی نظم یا شعر جس میں پیغمبرؐ کا نام ہوتا اور اقبال کو سنایا جاتا تو اقبال کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے اور در حقیقت وہ خود پیغمبر اکرمؐ کے عاشق تھے۔"

حقیقت میں اقبال نے ایک اچھے نکتے پر انگلی رکھی ہے۔ دنیائے اسلام پیغمبرؐ سے زیادہ محبوب

اور مقبول عام کون سی ہستی کو تلاش کر سکتی ہے؟ اور یہ چیز دنیائے اسلام کی تمام محبتوں کو مرکزیت عطا کرتی ہے اور اس سلسلے میں کچھ گفتگو کے بعد حاتم طائی کی بیٹی کی کہانی کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک جنگ میں حاتم طائی کی بیٹی قید میں لے لی گئی اور اُسے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں لاتے۔ پیغمبرؐ نے جب اس قیدی لڑکی کے سراپا بدن کو عریاں دیکھا تو پیغمبرؐ نے اس بڑے اور اچھے خاندان کی لڑکی کی عریانیت کو پسند نہیں کیا اور اپنی عبا اُٹھا کر اس لڑکی پر ڈال دی تاکہ وہ سرنگوں اور شرمسار نہ ہو اور اس کے بعد کہتے ہیں:

ما از آن خاتون طی عریان تریم
پیش اقوام جہان بی چادریم
روز محشر اعتبار ماست او
در جہان ہم پردہ دار ماست او
ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم
چون نگہ، نور دو چشیم و یکیم
از حجاز و مصر و ایرانیم ما
شبنم یک صبح خندانیم ما
مست چشم ساقی اعلاستیم
در جہان مثل می و میناستیم
چون گل صد برگ ما را بو یکی است
اوست جان این نظام و او یکی است

وہ "اسرار خودی" میں کوشش کرتے ہیں کہ احساسِ خودی یعنی انسانی تشخص کے احساس کو مسلمان فرد اور معاشرے میں زندہ کریں۔ اسرار خودی کا ایک اور باب یہ ہے کہ خودی سوال سے کمزور پڑ جاتی ہے یعنی جب ایک فرد یا ایک قوم نیاز مندی کا ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس فرد یا قوم کی خودی کمزور ہو جاتی ہے اور اپنے استحکام کو کھو بیٹھتی ہے اس سلسلے میں دلچسپ اور پُرمغز بحثیں اور بھی ہیں۔ خودی کے بعد، بے خودی کا فلسفہ ہے یعنی جب ہم "خود" اور ایک انسان کی شخصیت کی تقویت کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنے ارد گرد دیوار کھڑی کر لیں اور خود زندگی گزاریں بلکہ ان خود کو چاہیے کہ ایک معاشرے کے مجموعے میں بے خود ہو جائیں یعنی فرد کو معاشرے سے ارتباط حاصل کرنا چاہیے۔ یہ رموزِ بے خودی ہے اور "رموزِ بے خودی" نامی کتاب اقبال کی دوسری کتاب ہے اور "اسرار خودی" کے بعد لکھی اور شائع کی گئی ہے خود اسلامی نظام کے بارے میں اقبال کے خیال کی نشاندہی

کرتی ہے اور ایک اسلامی نظام سے قیام سے ۔ یہ اقبال کے افکار ہر جگہ موجود ہیں لیکن "رموز بے خودی" میں ہر جگہ سے زیادہ نظر آتے ہیں اور مجموعی طور پر وہ مسائل جن کا ذکر "رموز بے خودی" میں موجود ہے اہم اور دلچسپ موضوعات ہیں اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے ان پر توجہ ضروری ہے۔

آج جب ہم اقبال کے افکار کو "رموز بے خودی" کے مضامین میں دیکھتے ہیں جو ہمارے اسلامی معاشرے پر حکم فرما ہیں۔ اسلام کی ترویج میں امّت توحیدی کی ذمہ داری اقبال کے پُرجوش ترین نظریات میں سے ایک ہے اور ان کے خیال میں مسلمانوں اور امّت اسلامیہ کو جنہیں اسلام کی ترویج کرنی چاہیے، چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے تاکہ اس کام کو انجام دے سکیں۔ مناسب ہوگا کہ اس سلسلے میں اُن کے چند اشعار جو بہت دلچسپ ہیں پڑھ کر سناؤں۔

وہ کہتے ہیں: اسلامی معاشرے کی تشکیل اور دنیا کے لیے اسلامی امّت کا وجود میں آنا ایک آسان کام نہیں تھا اور دنیا بہت تکلیفیں اٹھانے اور تاریخ بہت سے تجربات کرنے کے بعد امّت توحیدی کو پا سکی ہے اور توحیدی نظریے اور اسلامی فکر کی حامل ایک امّت وجود میں آسکی ہے:

ایں کہن پیکر کہ عالم نام اوست
ز امتزاج امہات اندام اوست

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خون کرد تا یک لالہ رست

نقشہا آورد و افگند و شکست
تا بہ لوح زندگی نقش تو بست

نالہ ھا در کشت جان کاریدہ است
تا نوای یک اذان بالیدہ است

مدّتی پیکار با احرار داشت
با خداوندانِ باطل کار داشت

تخم ایمان آخر اندر گل نشاند
با زبانت کلمۂ توحید خواند

نقطۂ ادوار عالم لا الٰہ
انتہای کار عالم لا الٰہ

چرخ را از زور او گردندگی
مہر را تابندگی رخشندگی
بحر گوہر آفرید از تاب او
موج در دریا طپید از تاب او
شعلہ در رگہای تاک از سوز او
خاک مینا تابناک از سوز او
نغمہ ھایش خفتہ در ساز وجود
جویدت ای زخمہ در ساز وجود
صد نوا داری چو خون در تن روان
خیز و مضرابی بہ تار اور سان
زان کہ در تکبیر راز بود توست
حفظ و نشر لا الٰہ مقصود توست
تا نخیزد بانگ حق از عالمی
گر مسلمانی نیاسایی دمی
می ندانی آیہ ام الکتاب
امت عادل تو را آمد خطاب
آب و تاب چہرہ ی ایام تو
در جہان شاھد علی الاقوام تو
نکتہ سنجان را صدای عام دہ
از علوم امی ای پیغام دہ
ای ای، پاک از ہوا گفتار او
شرح رمز "ماغوی" گفتار او
از نوای لالہ ھای این چمن
پاک شست آلودگیہای کہن

اس کے بعد جب وہ اسلامی نظریے کی آفاقیت کو بیان کرتے ہیں، کہ البتہ ان کی کتاب میں شاید سو بار سے زیادہ اسلام اور مسلمان کی آفاقیت اور اس کے عالمی وطن کا ذکر آیا ہے، تو یہاں پر بھی کہتے ہیں، اے

امت توحید پرچم تیرے ہاتھ میں ہے، تجھے حرکت کرنی چاہیے اور دنیا تک پہنچانا چاہیے۔ بعد میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دلفریب جدیدیت جسے فرنگیوں نے پیدا کیا ہے، اس جدیدیت کو توڑ دے اور خود ہی بتاتے ہیں کہ یہ جدیدیت کیا ہے؟

ای کہ میداری کتابش در بغل
تیز تر نہ پا بمیدان عمل
فکر انسان بت پرستی، بت گری
ہر زمان در جستجوی پیکری
باز طرح آذری انداختہ است
تازہ تر، پروردگاری ساختہ است
کاید از خون ریختن اندر طرب
نام او، رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند
پیش پای این بت نا ارجمند
ای کہ خوردستی زمینای خلیل
گرمی خونت زصہبای خلیل
بر سر این باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ھو بزن
جلوہ در تاریکی ایام کن
آنچہ بر تو کامل آمد، عام کن

یہ ہے اسلام کی نشر و اشاعت اور قومیت اور وطن وغیرہ کی سرحدوں کو ختم کرنے کے سلسلے میں اقبال کا نظریہ۔ رموزِ بے خودی میں ایک مضمون جس پر وہ زور دیتے ہیں فرد کے اجتماع سے متصل ہونے اور فرد کے اجتماع میں حل اور جذب ہو جانے کی ضرورت ہے۔

وہ نبوت کو امت کی تشکیل کی اصل بنیاد جانتے ہیں اور کہتے ہیں ایسا نہیں کہ جب افراد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ایک قوم یا ملت وجود میں آجاتی ہے بلکہ ایک فکر کی ضرورت ہے جو ملیت یا قومیت کے تانے بانے کو یکجا کرے اور بہترین اور بنیادی ترین فکر نبوت کی فکر ہے جس کو خدا کے پیغمبروں نے آکر پیش کیا۔ ملت کی تشکیل کی بنیادوں کو وجود میں لانے کے لیے یہ بہترین چیز ہے کیونکہ یہ اجتماع کو فکر عطا کرتی ہے، ایمان عطا کرتی ہے اور

اتحاد عطا کرتی ہے نیز تربیت و کمال بخشتی ہے۔

ایک اور مضمون جس پر وہ زور دیتے ہیں خداوندان تخت و محراب کی بندگی کی نفی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے اشعار کا ایک حصہ بہت دلچسپ ہے۔ آپ بھی سُن لیں :

بود انسان در جہان انسان پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بند ہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت
باج بر کشت خراب او نوشت
در کلیسا اسقف رضوان فروش
بہر این صید زبون دامی بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرت او دون شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خون شدہ
تا امینی حق بہ حق داران سپرد
بندگان را مسند خاقان سپرد

کہ یہ اشعار رسول اکرم ؐ کی رسالت کی تشکیل، انسانوں کے مابین مساوات قائم کرنے اور ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم اور اخوت اسلامی کے بارے میں ہیں۔ خود انہوں نے جس طرح موضوعات اور عنوانات کا ذکر کیا ہے، بہت زیادہ ہیں، اور چونکہ میری گفتگو تفصیلی ہوگئی ہے، مناسب نہیں ہوگا کہ میں اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو کروں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ درحقیقت کون سے حصّے کا انتخاب کروں اور اس کے بارے میں گفتگو کروں کیونکہ انہوں نے اس قدر زیادہ دلچسپ اور اچھے موضوعات پر گفتگو کی ہے کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو فوقیت دی جائے اور بیان کیا جائے اور ان سب باتوں کے بیان کے لیے، ہمارے ملک میں علامہ اقبال کے کلام کے شائع کرنے کے سوا یہ کام کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ہے۔

یہ کام ایسا ہے جسے یہاں بھی، پاکستان اور افغانستان میں بھی ہونا چاہیے نیز ہر اُس جگہ پر جہاں لوگ فارسی سمجھتے ہیں یا ممکن ہے سمجھ سکیں اقبال کے کلام کو جس میں فارسی کا کلام بہترین ہے شائع ہونا چاہیے۔ البتہ جیسا کہ آپ کو علم ہے اقبال کے پندرہ ہزار شعروں میں سے نو ہزار فارسی میں ہیں اور ان کا اُردو کلام فارسی سے بہت کم ہے۔ ان کے بہترین اشعار اور کم از کم معنی کے لحاظ سے اُن کا اہم ترین کلام وہی ہے جو انہوں نے فارسی میں کہا ہے۔ ان کی کلیات جو شاید بیس سال قبل یہاں پر شائع ہوئی اُس پر مزید کام اور محنت کی ضرورت ہے۔

میں جب سے اقبال کے کلام سے آشنا ہوا ہوں، دیکھتا تھا کہ اس کلام کی شرح اور وضاحت کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ کافی وضاحت نہیں ہے اور مجھے اس بات کا دکھ ہوتا تھا یعنی حقیقت میں اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ کام انجام پائے اور کچھ لوگ حتیٰ ان لوگوں سے لیے جن کی زبان فارسی ہے علامہ اقبال کے مدِّنظر مضامین اور مفاہیم کی تشریح کریں۔

آج اقبال کے بہت سے پیغامات ہم سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن میں سے بعض اُس دنیا کے لیے ہیں جو ابھی تک ہمارے راستے پر نہیں آئی ہے اور اُس پیغام کو جس کو ہم سمجھ گئے ہیں اُس نے نہیں سمجھا ہے۔

اقبال کے "خودی" کے پیغام کو ہماری قوم نے میدان عمل میں اور حقیقت کی دنیا میں عملی جامہ پہنایا لہٰذا ہماری قوم کے لیے ضرورت نہیں کہ اسے "خودی" کا مشورہ دیا جائے۔ ہم ایرانی عوام آج مکمل طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہیں، اپنی ثقافت اور اپنی چیزوں پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس تمدن پر جس کو اپنی آئیڈیالوجی اور فکر کی بنیاد پر استوار کر سکتے ہیں۔ البتہ ماضی میں مادی زندگی اور زندگی گزارنے کے لحاظ سے ہماری تربیت دوسروں کے سہارے پر کی گئی، لیکن ہم تدریجی طور پر اپنے خیموں سے ان غیر ملکی رسیّوں کو بھی کاٹ پھینکیں گے اور اپنی ہی رسیّوں کا استعمال کریں گے اور ہمیں امید ہے کہ اس کام میں کامیاب ہوں گے۔

مسلمان اقوام کو اس "خودی" کو سمجھنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر مسلمان شخصیتوں کو خواہ وہ سیاسی شخصیتیں ہوں یا ثقافتی شخصیتیں۔ انہیں ضرورت ہے کہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور جان لیں کہ اسلام اپنی ذات میں اور اپنی اصلیت میں انسانی معاشروں کو چلانے کی اعلیٰ ترین بنیادوں کا حامل ہے اور دوسروں کا محتاج نہیں ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ دوسری ثقافتوں کے لیے دروازہ بند کر دیں اور اُن کو اپنی طرف جذب نہ کریں۔ جی ہاں! ہمیں جذب کرنا چاہیے لیکن ایک زندہ جسم کی مانند جو ضروری عناصر کو اپنے لیے جذب کرتا ہے تاکہ

اُس بے ہوش اور مردہ جسم کی مانند جس میں جو چاہتے ہیں داخل کر دیتے ہیں۔

ہم میں جذب کرنے کی توانائی ہے اور دوسری ثقافتوں اور دوسروں کے افکار سے خواہ غیر ملکی ہوں اُس چیز کو جو ہم سے تناسب رکھتی ہو، تعلق رکھتی ہو اور ہمارے لیے مفید ہو اخذ کرتے ہیں اور جذب کرتے ہیں لیکن جس طرح کہ اقبال بار بار کہتے ہیں علم و فکر کو مغرب سے سیکھا جا سکتا ہے لیکن سوز و زندگی کو نہیں ؎

خرد آموختم از حکیمانِ فرنگ

سوز اندوختم از صحبت صاحب نظراں

ایسی کوئی چیز (یعنی سوز و زندگی) مغرب کی تعلیم اور مغربی مدنیت کے تمدن میں نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کو اقبال نے سب سے پہلے ایک علم بردار کی شکل میں محسوس اور اعلان کیا ہے۔

مغربی تمدن اور مادی مدنیت (مادی شہری زندگی) انسان کے لیے ضروری روح اور معنی سے خالی ہے۔ لہٰذا ہم مغربی ثقافت سے اُس چیز کو لیتے ہیں جو ہمارے لیے ضروری ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک اور ہمارے عوام میں خودی اور اسلامی شخصیت کا احساس کمال کی حد تک موجود ہے اور ہماری نہ شرقی نہ غربی لا شرقیہ ولا غربیہ کی پالیسی بالکل وہی چیز ہے جس کی بات اقبال کرتے تھے۔ ہمارا پیغمبرؐ اور قرآن سے عشق اور قرآن سیکھنے کے لیے ہماری نصیحت اور یہ بات کہ انقلابوں اور مقاصد کی بنیاد اسلامی اور قرآنی ہونی چاہیے بالکل وہی چیز ہے جس کا مشورہ اقبال دیتے تھے لیکن اُس وقت اُن باتوں کو سُننے والا کوئی نہیں تھا۔

اُن دنوں اقبال کی زبان اور اقبال کے پیغام کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اقبال کی کتابیں اور نظمیں اُس شکایت سے بھری ہوتی ہیں کہ میری بات کو نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے اور نگاہیں دوسری جگہوں اور مغرب کی جانب ہیں۔ شاید اس رموزِ بے خودی کے مقدمے میں وہ یہ شکایت کرتے ہیں اور امتِ اسلام کو مخاطب کر کے اور بقول خود انکے پیشکش بہ حضور ملتِ اسلامیہ کہتے ہیں ؎

ای ترا حق خاتمِ اقوام کرد

بر تو ہر آغاز را انجام کرد

ای مثالِ انبیاء پاکانِ تو

ہمگر دلہا جگر چاکانِ تو

ای نظر بر حسنِ تر سازادہ ای

ای ز راہِ کعبہ دور افتادہ ای

ای فلک مشتِ غبار کوی تو
"ای تماشاگاہِ عالم روی تو"
ہمچو موج، آتش تہ پا می روی
"تو کجا بہر تماشا می روی"
رمزِ سوز آموز از پروانہ ای
در شررِ تعمیر کن کاشانہ ای
طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کن با مصطفیٰؐ پیمانِ خویش
خاطرم از صحبتِ ترسا گرفت
تا لقابِ روی تو بالا گرفت
ہم نوا از جلوہ اغیار گفت
داستانِ گیسو و رخسار گفت
بردرِ ساقی جبین فرسود او
قصہ ی مغ زادگان پیمود او
من شہیدِ تیغ ابروی توام
خاکم و آسودہ ی کوی توام
از ستایش گستری بالاترم
پیش ہر دیوی فرو ناید سرم

یعنی اے امّت اسلام! میں جو اِس عاشقانہ طور پر تیری مدح سرائی کر رہا ہوں، اِس لیے نہیں ہے کہ میں مدّاح ہوں۔

از سخن آئینہ سازم کردہ اند
از سکندر بی نیازم کردہ اند
بارِ احسان بر نتاب از گردنم
در گلستان غنچہ گردد دامنم
سخت کوشم مثلِ خنجر در جہان
آب خود می گیرم از سنگِ گران

یہاں پردہ اپنی بے نیازی کی بات کرتے ہیں اور اُس وقت اقبال اس بے نیازی کے ساتھ کردہ دنیا کے سامنے سر نہیں جھکاتے امّت اسلامیہ کے سامنے دوزانو بیٹھ کر التماس کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچان، آ اپنے آپ کی جانب لوٹ اور آ قرآن کی بات سُن ؛

بر درت جانم نیاز آوردہ است

ھدیہ ی سوز و گداز آوردہ است

ز آسمان آبگون یم می چکد

بر دل گرمم دما دم می چکد

من ز جو باریکتر می سازمش

تا بصحن گلشنت اندازمش

اگر ہم آخر تک اُن کی بحثوں اور اشعار کو پڑھنا چاہیں تو بحث کی شکل ہی بدل جائے گی اور کافی زیادہ وقت لگے گا۔ اور یہ تو ہمارے اُس عزیز اور پیارے اقبال کی شخصیت کا ایک خلاصہ ہے جو بلاشک مشرق کے بلند اقبال ستارے ہیں اور بے جا نہ ہوگا اگر ہم اقبال کو اس لفظ کے حقیقی معنی میں مشرق کا بلند ستارہ پکاریں۔ بہرحال ہمیں امید ہے کہ ہم اقبال کا حق ادا کر سکیں اور گزشتہ چالیس پچاس برس کے دوران اقبال کی شناخت میں اپنی قوم کی تاخیر کا ازالہ کر سکیں۔

اقبال کی وفات گویا ۱۳۱۷ ہجری شمسی مطابق ۱۹۳۷ء میں ہوئی اور میرے خیال میں اس وقت سے اب تک یعنی اقبال کی وفات کے بعد سے آج تک کا جو ایک طویل عرصہ ہے، اگرچہ اقبال کے نام سے سیمینار ہوتے، کتابیں لکھی گئیں اور تقریریں ہوئیں لیکن سب بیگانہ وار اور دُور سے تھیں اور ہماری قوم اقبال کی حقیقت، اقبال کی روح اور اقبال کے عشق سے بے خبر رہی ہے اور اس عیب کی انشاءاللہ تلافی ہونی چاہیے اور وہ لوگ جو اس کام سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً شعراء، مقررین، مصنفین، جرائد اور متعلقہ سرکاری ادارے وزارت مثلاً ثقافت و اعلیٰ تعلیم، وزارت تعلیم و تربیت اور وزارت ارشاد اسلامی، ہر ایک انشاءاللہ اپنی باری سے کوشش کریں کہ اقبال کو اس طرح جیسا کہ وہ ہیں زندہ کریں اور ان کے کلام کو کورس کی کتابوں اور دیگر کتابوں میں شامل کریں اور پیش کریں۔ ان کی کتابوں اور اشعار کو الگ الگ شائع کریں، اُسرار خودی کو علیحدہ، رموزِ بے خودی کو الگ، گلشن راز جدید کو علیحدہ، جاوید نامہ کو الگ اور اس قسم کے کام جو کسی حد تک پاکستان میں ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ پاکستان کے عوام ان تعبیرات سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ وہاں پر فارسی پہلے کی طرح رائج نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ خلیج بھی پاٹ دی جائیگی۔ ہمارے پاکستانی بھائی جو یہاں پر موجود ہیں اور اسی طرح برِّصغیر ہندوستان کے تمام ادیب اپنا فرض جانیں کہ فارسی زبان کے سلسلے میں خیانت آمیز

سیاست کا مقابلہ کریں اور فارسی زبان کو جو عظیم اسلامی ثقافت کا ذریعہ ہے اور اسلامی ثقافت کا بڑا حصّہ فارسی زبان میں اور فارسی زبان پر منحصر ہے برصغیر ہندوستان میں جہاں پر مسلمان اصلی عنصر ہیں رواج دیں اور ہمارے خیال میں خاص طور پر پاکستان میں یہ کام تیزی کے ساتھ ہونا چاہیے اور خود ہمارے ملک میں بھی مختلف اشاعتیں جو انجام نہیں پاتی ہیں، انجام پانی چاہییں اور فنکار حضرات اقبال کے کام پر فنکاری دکھائیں، پڑھنے والے ان شعروں کو پڑھیں، ان پر دُھنیں تیار کریں اور انشاء اللہ ان کو رواج دے کر ہمارے جوان اور بوڑھے عوام کی زبان اور دل میں لائیں۔

ہمیں امید ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں توفیق عطا کرے گا کہ ہم اپنے تئیں اُمّت اسلامیہ پر اقبال کے عظیم حق کو ادا کر سکیں۔

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اقبال سیمنار کے لیے
جناب سید علی خامنہ ای
کا

تکمیلی پیغام

جناب ڈاکٹر مجتبوی صاحب!

صدر، اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے والی کمیٹی!

اگرچہ آج کی تقریر میں علامہ محمد اقبال کی شخصیت کے پہلوؤں پر صرف مختصر روشنی ڈالی گئی اور قرنِ حاضر کی اس عظیم اسلامی شخصیت کے بارے میں زیادہ تر باتیں نہیں کہی گئیں لیکن دو نکتوں کا بیان جس کا ذکر نہ کرنا درحقیقت اقبال پر ظلم ہوگا، ضروری سمجھتا ہوں:

پہلا نکتہ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں ہے جو یقینی طور پر اقبال کی زندگی اور شخصیت کے نمایاں

ترین نکات میں سے ہے۔

حقیقتاً یہ کہنا ضروری ہے کہ پاکستان کے بانیوں اور اُن میں سرفہرست قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے اقبال کی اس جاودانی نصیحت پر جو وہ مسلمان انسان کو مخاطب کر کے کرتے ہیں کہ:

تو شمشیری ز کام خود برون آ
برون از نیام خود برون آ
شب خود روشن از نور یقین کُن
ید بیضا برون از آستین کُن

عمل کیا اور اپنی انتھک کوششوں اور جدوجہد کے ذریعے اُس فکر کو جس کو علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں ہونے والی مسلم لیگ کی کانفرنس میں پیش کیا تھا، سترہ سال بعد جامۂ عمل پہنایا۔

پاکستان کا قیام جو ہندوستانی مسلمان کی شخصیت کے تحفظ اور احیاء کا واحد ذریعہ تھا یقیناً اقبال کے عظیم تفریہ کاموں میں سے ایک ہے۔ مسلمانوں کے ہندوستان سے الگ ہونے کے سلسلے میں جواہر لعل نہرو سے قائداعظم کی بحثوں میں جو دلیلیں نظر آتی ہیں اور جن کی بنیاد ہندوستانی مسلمانوں کا ایک خود مختار قوم بننا ہے، یقیناً رموزِ بے خودی اور اقبال کے دوسرے کلام میں موجود اقبال کے نظریات پر مبنی ہے لہٰذا جیسا کہ خود پاکستانی بھائیوں نے کہا ہے اور اس بات کی تکرار کی ہے بلاشک اقبال پاکستان کے معمار اور پاکستان کا منصوبہ بنانے والے اور برصغیر میں مسلمانوں کو ایک خود مختار قوم کی شکل دینے والے ہیں۔

دوسرا نکتہ جو ہمارے ملک کے مسلمان اور عبادت گزار عوام کے لیے یقیناً دلچسپی اور لذت بخش ہے، اقبال کی ذاتی خصوصیات کے بارے میں ہے۔ ہمارے عوام کے لیے یہ جاننا دلچسپ ہے کہ اقبال جنہوں نے مغربی ثقافت اور تمدن کو اچھی طرح پہچانا اور اپنی عمر کے ایک اہم حصے کو مغربی افکار کی تعلیم حاصل کرنے میں صرف کیا، اپنی ذاتی رفتار اور طرزِ زندگی میں زاہدوں اور عابدوں میں سے ایک تھے اور وہ میل جول اُن کے اسلامی اعمال اور آداب نیز اُن کی ذاتی زندگی پر ہرگز بھی اثر انداز نہیں ہوا۔

وہ ایک عبادت گزار، قرآن سے مانوس، اہلِ تہجد اور ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کرنے والے تھے اور حتیٰ یورپ میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں بھی انہوں نے اس روش کو ہرگز بھی ترک نہیں کیا۔ قرآن پر ان کا اعتقاد اس حد تک زیادہ تھا کہ اُن کے فرزند جاوید اقبال کے بقول قرآن کی آیتوں کو درخت کے پتوں پر لکھ کر بیماروں کو شفایابی کے لیے دیا کرتے تھے۔ رسول اکرمؐ بیت اللہ اور حتیٰ حجاز سے جو وہ کا مرکز تھا عشق کرتے تھے۔ اسلامی علوم میں اُن کی دلچسپی اس قدر زیادہ تھی کہ عمر کے آخری ایام میں چاہتے

تھے کہ اپنی سب کتابوں کو فروخت کر کے فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں خریدیں۔ وہ عارفانہ سوز و گداز رکھنے والے، تہجد کی نماز پڑھنے والے، زندگی کی پارسائی اور قناعت سے کام لینے والے نیز اسی قسم کی دوسری نمایاں خصوصیات کے حامل تھے۔

یہ وہ دو نکتے تھے جن کو میں اپنی تقریر کے تکملے کے طور پر اپنے ہم وطنوں کی اطلاع کے لیے عرض کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

(اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر جناب علی خامنہ ای کا تہران میں
منعقد ہونے والی بین الاقوامی اقبال کانگرس سے خطاب)

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر